کیا اسلام کی اشاعت میں جبر واکراہ کا دخل ہے؟

از: مولانا اسرار الحق قاسمی

موجودہ صدی میں مسلمانوں کی تذلیل وتحقیر اور عالمی منظرنامے پر ان کی شبیہ خراب کرنے کے لیے جو منظّم سازشیں ہورہی ہیں، ان ہی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ عیسائی مشنریز اور ایسی تمام قوتیں، جو اسلام کو ایک آفاقی اور تاریخ کے ہر دور اور ہر موڑ پر انسانیت کی راہ بری وراہ نمائی کرنے والے مذہب کے طور پر تسلیم نہیں کرتیں، وہ وقتاً فوقتاً اسلام کی بنیادی تعلیمات، قرآن کریم، احادیث کے معتد بہ حصے اور نبی پاک ﷺ کی سیرتِ پاک کو اپنے اوچھے اور بکواس اشکالات و اعتراضات کا نشانہ بناتی رہتی ہیں، ان ہی اشکالات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نعوذ باللہ محمد ﷺ نے اپنے دین کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے تلوار کا سہارا لیا اور ان کی زندگی میں جتنے لوگ بھی اسلام میں داخل ہوئے، وہ اپنی مرضی وخواہش سے نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کے زورِ شمشیر سے داخل ہوئے؛ حالاں کہ تاریخی حقائق ان کی اس بیہودہ گوئی کا صاف اور صریح طور پر انکار کرتے ہیں، اگر آپ تبلیغِ اسلام کے ابتدائی ادوار اور پھر آپ ﷺ کی مکی و مدنی زندگی کا منصفانہ مطالعہ کریں، تو آپ کو صاف طور پر محسوس ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کا آغاز اجنبیت اور کمزوری کے دور میں شروع ہوا اور پھر جب مسلمانوں نے مدینہ کی جانب ہجرت کی اور کفار ومشرکین اور یہودیوں کی متعدد جماعتوں سے جو جنگیں ہوئیں، وہ سب انتہائی مجبوری میں ہوئیں، ورنہ ہمارے نبیؐ کے جیسا صلح پسند اور امن جُو انسان روے زمین نے آج تک نہیں دیکھا، ہر موقعے پر آپ نے کُشت و خون اور جنگ وجدال کو ٹالنے کی کوشش کی؛ مگر جب فریقِ مخالف مرنے مارنے پر ہی آمادہ نظر آیا، تبھی آپ نے اپنے اصحاب کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی، پھر دورانِ جنگ بھی آپ نے اپنے مجاہدین کو انسانی اصول واقدار کا حد درجہ پابند رکھا؛ کیوں کہ آپؐ پوری انسانیت کے لیے رحمت و رافت بنا کر بھیجے گئے تھے اور انسانی حرمت آپ کے نزدیک سب سے اعلیٰ وبرتر تھی، عہدِ نبوی کی

جنگوں میں جو جانوں کا اتلاف ہوا، اس سے بھی کوئی بھی عقلِ سلیم رکھنے والا انسان بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں زور زبردستی اور تیغ وتفنگ کا عمل دخل بالکل بھی نہیں تھا اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا، جبکہ اللہ تعالیٰ صاف طور پر "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" اور "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنُ" کا اعلان کر چکا تھا، اسلام کی اشاعت میں اَصالۃً بے مثال سیرتِ نبوی اور آپ کے اصحابؓ کے کردار و عمل کا دخل رہا، انھوں نے جس ملک یا شہر کو فتح کیا، تو حسبِ روایت وہاں تباہی و تاراجی مچانے کی بجائے وہاں کے لوگوں کو امان دیا، انھیں پُرامن طور پر اسلام کی دعوت دی اور اگر انھوں نے نہیں مانا، تو بہت معمولی جزیے کے عوض انھیں ان کے دین پر چھوڑ دیا، عیسائیت اور استشراق کی جانب سے اسلام کی شبیہ کو خراب کرنے والا یہ اعتراض؛ بلکہ اتہام اور بہتان کتنا صریح جھوٹ ہے کہ خود کئی ایک مستشرقین نے اپنی کتابوں میں اس کی تردید کی ہے، معروف مستشرق عالم "ٹامس کارلائل" (۱۸۸۱-۱۷۹۵ء) نے اپنی کتاب On Heroes, Hero-w ership,and the Heroic in History میں جہاں نبی پاکؐ کو تمام انبیا کے سردار کے طور پر مانا اور پیش کیا ہے، وہیں اس نے اسلام کی اشاعت میں تلوار کے عمل دخل کو قطعاً جھوٹ اور یاوہ گوئی قرار دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "یہ عقل میں آنے والی بات ہی نہیں کہ ایک شخص، جو اپنی دعوت کے ابتدائی دنوں میں بالکل تن تنہا ہو، کوئی اس کو ماننے والا نہ ہو، وہ اکیلے پوری قوم اور جماعت کے خلاف تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہو اور انھیں اپنے آپ کو منوانے پر مجبور کر دے"۔ (محمد المثل الأعلیٰ، تعریب: محمد السباعي، ص: ۲۱، مکتبة النافذة، مصر ۲۰۰۸ء)

کارلائل کے علاوہ بھی متعدد مسیحی اور مستشرق علماء، ادباء اور شعراء نے اس بات کا نہ صرف اعتراف کیا ہے کہ نبی پاکؐ کی ذات سراپا رحمت تھی؛ بلکہ انھوں نے انصاف پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے اپنے طور پر دلائل کے ذریعے اس کو ثابت بھی کیا ہے، گوکہ ان کے مقابلے میں سیرت نبوی اور اسلام کو اپنے سطحی اعتراضات واشکالات کا نشانہ بنانے والوں کی تعداد زیادہ رہی اور انھوں نے پورے زور وشور سے اسلام کی شبیہ کو داغ دار کرنے کی مہم جاری رکھی اور آج کے ابلاغی وسائل کی بہتات اور بے پناہ کثرت کے دور میں وہ پہلے سے بھی زیادہ زور وشور سے اپنی یہ ناپاک مہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔

کیا دینِ مسیحی میں قتال کا تصور نہیں؟

قبل اس کے کہ ہم اسلام پر عیسائی مشنریز کی جانب سے تشدد پسندی وانتہا پسندی کے

الزامات کا تحقیقی جواب دیں، مناسب سمجھتے ہیں کہ اس خیال اور عام طور پر پھیلے ہوئے تصور کی حقیقت واضح کردی جائے کہ مسیحیت مطلقاً جنگ وجدال اور قتال کا انکار کرتی ہے، عیسائیوں سے پوچھا جانا چاہیے کہ انجیلِ متی میں حضرت عیسیٰ کی جانب جو یہ قول منسوب ہے کہ ''تم یہ مت سمجھو کہ میں زمین میں صلح وسلامتی قائم کرنے کے لیے آیا ہوں؛ بلکہ میں تو تلوار لے کر آیا ہوں، میں اس لیے آیا ہوں کہ انسان کو اس کے باپ کے خلاف کھڑا کردوں، بیٹی کو اس کی ماں کے خلاف اور چوپایوں کو چرواہوں کے خلاف، انسان کے دشمن اس کے گھر والے ہی ہوتے ہیں، جو شخص بھی اپنی ماں یا باپ سے مجھ سے زیادہ محبت کرے، تو وہ مجھ سے دورر ہے، جو شخص اپنے بیٹے یا بیٹی سے مجھ سے زیادہ محبت کرے، وہ بھی مجھ سے دور رہے، جو شخص اپنی صلیب نہ لے اور میری اتباع نہ کرے وہ مجھ سے دور رہے، جس نے زندگی کو پالیا (یعنی اپنے لیے اسے گزار دیا) اس نے دراصل اپنی زندگی کو گنوادیا اور جس نے میری خاطر اپنی زندگی کو گنوادی، تو گویا اس نے اپنی زندگی کے مقاصد کو پالیا''۔(باب:۱۰، آیت:۳۵) اس کا آخر ہم کیا مطلب نکالیں؟ ہم نام نہاد عیسائیت کے علم برداروں کے قول کو مانیں اور انجیل کی تکذیب کریں یا ان کو جھوٹا سمجھیں اور انجیل کے بیان کو صحیح اور سچ مانیں؟

یہودیت اور تشدد پسندی

جہاں تک بات توریت کی ہے، تو اس کے اندر تو ابھی بھی بے شمار ایسے مقامات ہیں، جہاں جنگ وجدال اور قتال کی مشروعیت کی بات کی گئی ہے، مزید یہ کہ دینِ موسوی کے حوالے سے جو شدت پسندی کی باتیں عام طور پر مشہور ہیں اور واقعتاً بھی اس شریعت میں جو کم سے کم گنجایش اور سہولت کے مواقع پائے جاتے تھے (گرچہ ان کی کچھ وجہیں بھی تھیں) اس سے بھی ہم اچھی طرح واقف ہیں اور ان دونوں معروف سماوی شریعتوں کے خلاف اسلام نے جنگ اور قتال کے جو اصول متعین کیے اور ان پر جس اہتمام کے ساتھ خود ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ اور مجاہدینِ اسلام نے سختی کے ساتھ عمل کیا اور جس طرح سے قرنِ اول میں مسلمانوں میں انسانی اقدار کے تحفظ وتکریم کی تابناک مثالیں پیش کیں، وہ اپنے آپ میں لازوال ہیں اور اس بات کا بیّن ثبوت کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار یا زور زبردستی کا ادنیٰ دخل بھی نہیں رہا۔

اس کے برخلاف عیسائیت کے ماننے والوں کی پوری تاریخ بے قصور انسانوں کے خون سے گل نار ہے، ماضی میں رومیوں نے بے شمار انسانوں کو تہہ تیغ کیا، متعدد یورپی قوموں نے

انسانی خون کو پانی کی طرح بہایا، گیارہویں، بارہویں صدی عیسوی میں جو سلسلہ وار جنگیں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھیں، وہ خود عیسائیوں نے ہی بھڑکائی تھیں، چپے چپے سے ان کی افواج نے جمع ہوکر اسلامی مملکت وخلافت پر حملے کیے، مسلمانوں کو قتل کیا اور اس اندوہناک انسانیت کش مہم کی پشت پر اعلانیہ طور پر ان کے مذہبی رہنما، راہب اور پاپاؤں کا ہاتھ رہا۔ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں، جن کا انکار نہ تو مسیحی علما کر سکتے ہیں اور نا ہی مستشرقین۔

پھر بیسویں صدی میں جو پوری دنیا میں صلیبی حکومت قائم کرنے کے جنون میں دنیا کے طول وعرض پر حملے کیے گئے، وہ سب بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہی ہیں، تاریخ میں برطانیہ، روم، اٹلی، فرانس اور امریکی اتحاد کے ترجمان لارڈ للنبی کا وہ قول بھی محفوظ ہے، جس میں اس نے ۱۹۱۸ء میں پہلی عالمی جنگ کے اختتام اور بیت المقدس پر قبضے کے موقع پر کہا تھا کہ ”صلیبی جنگوں کا اختتام تو اب ہوا ہے“ اسی موقع پر فرانسیسی ترجمان نے دمشق میں اسلامی قائد سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کے پاس جا کر یہ کہا تھا کہ ”صلاح الدین! ہم واپس آگئے“۔

بوسینیا، چیچنیا، ہرزے گوینا اور متعدد افریقی ملکوں میں جو مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو پر بے تحاشا ڈاکے ڈالے گئے، وہ بھی صلیبیت کے ہی نام پر تھے۔

حالاں کہ ان سب کے برخلاف اسلام نے اپنے تمام تر تاریخی مراحل میں اپنی صاف شفاف اور روشن تعلیمات کے ذریعے انسانی قلوب کو مسخر کیا، عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، جنگ وامن کے دوران دی جانے والی اس کی ہدایتیں، غلبہ اور فتح کے دوران اس کی انسانیت نوازی پر مبنی تعلیم اور اس کے مبنی بر انصاف سیاسی نظام نے لوگوں کو ہر دور میں اپنی جانب مائل کیا اور وہ اس کی صداقت وحقانیت کے قائل ہوکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے رہے، اسلامی قلم رو میں جو دوسرے مذاہب کو ماننے والی قومیں رہتی تھیں، انھیں پوری امان ملتی تھی، ایسی جیسی ان کے اپنے ہم مذہب بادشاہ بھی نہیں دیتے تھے۔

اسلامی دعوت کی تاریخ اور فرضیتِ جہاد کے اسباب

اسلام کے مزاج میں سلامتی اور صلح جوئی کا عنصر شامل ہے، تو پھر اس نے جہاد کو فرض کیوں قرار دیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا جواب ہمیں اسلام کے بالکل ابتدائی دور، نبی پاک ﷺ کی سیرتِ مبارکہ، خلفاے راشدین، دیگر اصحاب وتابعین اور موجودہ انسانی تاریخ، سب کو سامنے رکھتے ہوئے تلاش کرنا ہوگا، ویسے یہ تو ایک واضح سچائی ہے کہ باوجودیکہ کم وبیش ایک ہزار سال

تک مسلمانوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی؛ لیکن آج بھی ان کی تعداد دنیا کی مجموعی آبادی کا زیادہ سے زیادہ ۲۲/ فیصد ہے، یعنی سات ارب میں سے ایک ارب ستر کروڑ کے لگ بھگ، یہ بھی اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں نے دین کی اشاعت میں زبردستی سے کام نہیں لیا؛ کیوں کہ اگر وہ چاہتے، تو کم از کم اپنی سیاست کے عروج کے زمانے میں تو ایسا کرہی سکتے تھے کہ دنیا بھر کی قوموں کو شمشیر کی نوک پر اسلام کے دائرے میں داخل کرلیتے؛ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

(۱) بعثت کے بعد نبی پاکؐ مکے میں تیرہ سال تک مقیم رہے، اس دوران آپ نے مکہ والوں کو توحید، رسالت اور قرآنی و اسلامی تعلیمات کو قبول کرنے کی دعوت دی، اس دوران مکہ کے بہت سے خوش نصیب افراد نے ایمان قبول بھی کیا، ان میں اشرافِ قوم بھی تھے اور کم درجے کے لوگ بھی؛ البتہ نچلے درجے کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی اور اس حقیقت میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ نبی پاکؐ کے پاس اتنا مال و دولت نہیں تھا کہ جسے لوگوں میں تقسیم کرکے انھیں اسلام کی طرف راغب کرتے، یہی وجہ ہے کہ اسلام لانے کی پاداش میں مسلمانوں اور ان میں سے بھی فقرا اور غربا اور کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والوں کو کفار مکہ کی جانب سے سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا؛ لیکن چوں کہ انھوں نے کسی ظاہری لالچ یا خوف کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ دل کی رضا سے اسلام قبول کیا تھا؛ اس لیے ان کے ایمان و یقین میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی؛ بلکہ انھیں جتنا زیادہ تکلیفوں سے گزارا گیا، ان کی قوتِ ایمانی میں اتنا زیادہ اضافہ ہوتا گیا، یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس دور میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ جس میں کسی شخص نے اسلام لانے کے بعد اس دین سے نفرت اور ناپسندیدگی کی وجہ سے ردّت اختیار کرلی ہو یا اسے کفار و مشرکین کے مکر و فریب نے اپنے دین اور مذہب سے بیزار کردیا ہو؛ بلکہ اس کے برخلاف ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جن میں بعض مسلمانوں کو جب اسلام کے راستے میں سخت سے سخت عذاب دیا گیا، انھیں آگ میں ڈالا گیا یا ننگی جلتی ہوئی ریت پر کھلے بدن گھسیٹا گیا، تو انھیں ایک خاص قسم کی روحانی لذت، ٹھنڈک اور حلاوت محسوس ہوئی۔

(۲) پھر جب کفارِ مکہ کی جانب سے اذیتوں کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور مسلمانوں کے لیے مکے میں رہنا نہایت ہی ناممکن ہوگیا، تو اللہ کے نبیؐ نے بعض کمزور اور مصیبت زدہ مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت دے دی؛ چنانچہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشے

کی جانب ہجرت کرلی، پھراس کے بعد ہجرتِ کبریٰ یعنی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کا واقعہ رونما ہوا، اس میں نبی پاکؐ کے ساتھ تمام صحابۂ کرامؓ بھی شامل تھے، ان سبھوں نے محض اسلام کی حفاظت اور دین کی تبلیغ واشاعت کی خاطر اپنے گھربار، آل اولاد اور اموال وجائیداد تک کو چھوڑ دینا گوارہ کرلیا، مدینے کے قیام کے دوران شروع کے ایک ڈیڑھ سال تک آپ وہاں کے لوگوں کو انتہائی پُرامن طریقے سے اور حکمت وموعظت کے ساتھ دین کی تبلیغ کرتے رہے، مدینے کے بہت سے لوگ اور قبیلے مدینے میں آپ کی آمد سے پہلے ہی مکہ جاکر اپنی مرضی اور دلی خوشی کے ساتھ اسلام قبول کرچکے تھے، مکہ کے تیرہ سال اور مدینہ کے تقریباً ڈیڑھ سالوں کے درمیان مسلمانوں کی جو حالت تھی، وہ سیرت وتاریخ کی کتابوں میں موجود ہے اور اسے جاننے اور پڑھنے کے بعد کوئی ناعقل، متعصب اور بغض وحسد کے خطرناک مرض کا شکار شخص ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ جتنے بھی لوگوں نے اسلام قبول کیا، وہ خارجی دباؤ، ڈر، خوف یا لالچ کی وجہ سے کیا۔

(۳) ہجرتِ مدینہ کے دوسرے سال کے اواخر یا نصف میں مسلمانوں کو جہاد اور کافروں کے خلاف مقاتلے کی اجازت مل گئی؛ لیکن یہ جہاد اس لیے نہیں مشروع کیا گیا کہ اس کے ذریعے سے کافروں اور مشرکوں کو زبردستی دائرۂ اسلام میں داخل کیا جائے؛ بلکہ اللہ نے اسے اس لیے مشروع کیا کہ اس کے ذریعے سے دینِ اسلام کا دفاع کیا جائے، اس کو درپیش مشکلات اور عوائق وموانع کا مقابلہ کیا جائے اور اس کی اشاعت کی راہ میں حائل ہونے والوں کو دور کیا جائے، مسلمانوں کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے، روئے زمین پر ایک خدا کی پرستش اور عبادت کے تصور کو عام کیا جائے، ظلم وزیادتی، ناانصافی، بے امنی کا خاتمہ کیا جائے، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قتال اور جہاد کا حکم دیتے وقت بھی مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ ایسے لوگوں پر دورانِ جنگ ہاتھ نہ اٹھائیں، جنھوں نے مذہب کے نام پر انھیں پریشان نہیں کیا اور ان کی ایذا رسانیوں میں دوسروں کے ساتھ شریک نہ رہے، مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ دورانِ جنگ ایسے لوگوں سے اپنے ہاتھ کھینچے رکھیں، ان کے ساتھ انصاف اور حسنِ سلوک کا معاملہ کریں، ارشاد ہے:

”لَا یَنْهَاکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَیْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ، إِنَّمَا یَنْهَاکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَأَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ، وَظَاهَرُوْا عَلٰی إِخْرَاجِکُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ، وَمَنْ یَتَوَلَّهُمْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ“. (الممتحنة: ۸-۹)

اس آیتِ کریمہ سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا موقف یہ نہیں کہ اگر تم ہمارے ساتھ صلح کرو، تو ہم تمہارے ساتھ صلح پسندی کا معاملہ کریں گے؛ بلکہ وہ کافروں کی جماعت کے ساتھ بھی رحم وکرم اور حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے، پھر قرآنِ کریم میں دین سے روکنے والے اور دین کے راستے میں روڑا اٹکانے والے کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کا جو حکم دیا گیا، تو مطلقاً نہیں؛ بلکہ اس میں بھی حدود وقیود طے کردیے گئے اور حدِ اعتدال سے تجاوز کو ممنوع قرار دیا گیا:

”وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم و لا تعتدوا“. (البقرة:۱۹۰)

یہ اوران کے علاوہ دیگر قرآنی آیتوں اور خدائی احکام کی روشنی میں نبی پاکؐ نے اپنے اصحاب اور مجاہدین کو جنگ کے رہنما اصول بتائے، جن پر وہ ہمیشہ کاربند رہے، کمزوری ومغلوبیت کے زمانے میں بھی اور فتح اور غلبہ کے بعد بھی، انھوں نے کسی بھی موقع پر مفتوحین کے ساتھ روایتی فاتحین جیسا حیوانی سلوک نہیں کیا، انھوں نے کسی بھی جنگ میں عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا، انھوں نے کسی بھی شہر یا ملک کو فتح کرنے کے بعد شہریوں کے اموال وجاے داد اور عورتوں کو اپنی ملکیت نہیں بنایا اور ان کی عصمت وعفت پر دست درازی نہیں کی؛ بلکہ اسلامی ضابطے کے مطابق اپنے سپہ سالار کی ہدایت پر عمل کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ایسے کردار سے متاثر ہونے والوں اور پھر دامنِ اسلام سے وابستہ ہونے والوں میں مسلسل اضافہ ہوا اور اسلام اپنی آمد کے بعد بہت ہی کم دنوں میں دنیا بھر کے بیشتر خطوں میں پھیل گیا۔

(۴) اسلام کی بنیادی تعلیمات (نصوصِ قرآن، احادیثِ کریمہ) اس تصور کو سرے سے مسترد کرتی ہیں کہ اس کی اشاعت میں کسی بھی قسم کی زور زبردستی کا دخل رہا ہے، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس چیز کو بیان کیا گیا ہے، ارشادِ باری ہے:

”لا اكراه فى الدين قدتبين الرشد من الغي، فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقىٰ لا انفصام لها، والله سميع عليم“. (البقره:۲۵۶)

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت اور گمراہی دونوں واضح ہیں، پس جو شخص باطل معبودوں کا انکار کرکے ایک خدا پر ایمان لے آیا، اس نے مضبوط چیز کو تھام لیا جو جدا ہونے والی نہیں ہے اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے سببِ نزول کو جان لینا بھی دل چسپی سے خالی نہیں، مفسرین نے بیان کیا ہے کہ انصار کے بنی سالم بن عوف کے ایک شخص کے پاس دو بیٹے تھے، جو بعثتِ نبوی سے قبل

ہی نصرانی مذہب اختیار کر چکے تھے، ایک زمانے کے بعد وہ دونوں نصرانیوں کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ تجارت کی غرض سے آئے، ان کے والد (جو مسلمان ہو چکے تھے) نے جب انھیں دیکھا، تو ان کے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے کہ جب تک تم دونوں مسلمان نہیں ہو جاتے، میں تمھیں چھوڑوں گا نہیں، یہاں تک کہ یہ معاملہ نبی پاک ﷺ تک پہنچ گیا، انصاری صحابیؓ نے آپ سے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ میرے جسم کے ٹکڑے جہنم میں داخل ہوں اور میں دیکھتا رہوں؟ (ایسا نہیں ہوسکتا) اسی موقع پر مندرجۂ بالا آیتِ کریمہ نازل ہوئی، جس میں یہ واضح کر دیا گیا کہ ایمان اور کفر انسان کا ذاتی معاملہ ہے، کوئی کسی کو ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا؛ چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹوں کا راستہ چھوڑ دیا۔

امام زہری فرماتے ہیں کہ میں نے قول باری تعالیٰ ''لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ'' کے بارے میں زید بن اسلم سے دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے مکے کی زندگی میں کسی کو مذہبِ اسلام اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا، اس کے باوجود کفار آپ ﷺ کی جان کے درپے ہوگئے، تو ایسے موقع پر اللہ نے آپ کو ان سے لڑنے کی اجازت مرحمت فرما دی اور لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس میں داخل ہونے کے لیے کسی کو مجبور کریں۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

"افأنت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین". (یونس:۹۹)

ترجمہ: کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے کے لیے مجبور کریں گے؟ (یعنی آپ ایسا نہیں کر سکتے)۔

ایک اور جگہ فرمایا:

"فمن شاءَ فلیؤمن، ومن شاءَ فلیکفر''. (الکھف:۲۹)

ترجمہ: جو چاہے وہ ایمان لائے اور جو چاہے وہ کفر کرے (یعنی اپنی مرضی سے جو شخص ایمان قبول کرے گا، اسے اس کا اجر ملے گا اور جو انکار و شرک کا ارتکاب کرے گا، وہ اس کے انجامِ بد سے دوچار ہوگا، اس معاملے میں کسی پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا)

اس آیت سے صریح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر انسان کے اختیار اور رضامندی کا معاملہ ہے کہ جونسا مذہب چاہے، اختیار کرے اور جسے چاہے ترک کر دے، ہاں! بتقاضائے مصلحتِ انسانی و مقصدِ تخلیقِ انسانی اللہ تبارک و تعالیٰ کو دینِ وحدانیت پسندیدہ ہے، وہ ایمان و

اسلام کو پسند کرتا ہے اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے، جب کہ کفر سے روکتا ہے اور اس کے بدترین نتائج سے لوگوں کو باخبر کرتا ہے، قرآن کریم میں اس مفہوم کی آیتیں بکثرت پائی جاتی ہیں، اسلام کے ایک آخری پسندیدہ اور مکمل مذہب ہونے کی وجہ سے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مذہب کے معاملے میں انسانوں کو اختیار دینے کے باوجود فرمایا ہے:

”انا اعتدنا للظالمین ناراً احاط بھم سرادقھا“. (الکھف:۲۹)

ترجمہ: ہم نے کافروں کے لیے جہنم کی آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی طنابیں انھیں چاروں جانب سے گھیرلیں گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانا اور اس کی وحدانیت کا انکار کرنا انسانی تاریخ کا سب سے بڑا ظلم ہے؛ اس لیے قرآن میں جو مذہب کے حوالے سے عدمِ اکراہ اور تخییر کی بات آئی ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کفر وشرک کرنا جائز ہے یا اللہ تبارک وتعالیٰ ایسا کرنے والوں سے بھی راضی ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ علمائے تفسیر نے مذکورہ بالا آیتوں کو تہدید اور وعید پر مشتمل قرار دیا ہے، حتیٰ کہ بہت سے علمائے بلاغت تہدید ووعید کے مواقع پر بطور مثال کے ان ہی آیتوں کو پیش کرتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ گویہ آیتیں اپنی ظاہری نص کے اعتبار سے تخییر کے معنی پر مشتمل ہیں؛ لیکن یہ تخییر ایسی ہے کہ جس میں تہدید اور دھمکی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، ان آیتوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مذہب کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر اور زبردستی نہیں کی جائے گی؛ لیکن اس سے یہ ہرگز بھی نہ سمجھا جائے کہ اسلام کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے تمام موجودہ مذاہب حق پر ہیں اور انسان جس مذہب پر بھی چاہے اعتقاد رکھے اور اسی کے مطابق زندگی گزارے، ایسا ہرگز بھی نہیں، ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرنے کی سزا تو ملنی ہی ہے۔

احادیث میں بھی اس مفہوم کی روایتیں پائی جاتی ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:

امام مسلم نے اپنی صحیح میں اپنی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ”نبی پاک ؐ جب بھی کسی شخص کو کسی اسلامی فوج کا امیر اور سپہ سالار بناتے، تو اسے تقویٰ اختیار کرنے اور ساتھی مجاہدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کرتے، پھر فرماتے ”اللہ کے راستے میں اللہ کا نام لے کر لڑو، کافروں سے قتال کرو، لڑو اور دھوکہ وفریب نہ دو، لاشوں کا مثلہ نہ کرو، کسی نوزائیدہ بچے کو قتل نہ کرو اور جب بھی کسی مشرک قوم سے مقابلہ ہو، تو اسے تین باتوں کی دعوت دو، پھر وہ ان میں سے جس بات کو بھی قبول کرلے، تو تم اسے چھوڑ دو، پھر تم اسے اسلام کی دعوت دو، پس اگر وہ اسلام قبول

کرلے،توتم بھی انھیں قبول کرلواور انھیں کسی قسم کا گزند نہ پہنچاؤ اور اگر وہ لوگ انکار کریں،تو ان (کے تحفّظ کے لیے اُن) سے جزیہ مانگو،اگر وہ جزیہ دینے کے لیے تیار ہوجائیں،تو انھیں اپنے حال پر چھوڑ دو اور اگر وہ جزیہ دینے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوں،تو پھر تم اللہ کی نصرت ومدد طلب کرو اوران سے قتال کرو‘‘۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نبی نے مسلمانوں کو اسی وقت کافروں سے لڑنے کی اجازت دی،جب امن اور صلح کی کوئی راہ باقی نہ رہے اور قطعی طور پر یہ ثابت ہوجائے کہ کفارومشرکین اپنے کبروغرور اور خدا بیزاری میں حد سے گزرے ہوئے ہیں،ہاں اس ذیل میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جزیہ لوگوں کو اسلام پر مجبور کرنے کے لیے نہیں؛ بلکہ یہ اسلامی مملکت وحکومت کے ذریعے ان کی خدمات،حفاظتی تدابیر اور نگہہ داشت کے عوض ہے،اسلامی تاریخ میں اس کی ایک واضح ترین اور سب سے بڑی دلیل وہ واقعہ ہے،جسے علامہ بلاذری نے اپنی کتاب ’’فتوح البلدان‘‘ میں نقل کیا ہے کہ جب ہرقل نے مسلمانوں سے مقابلے کے لیے اپنے لوگوں کو اکٹھا کیا اور یرموک کا واقعہ پیش آیا،تو مسلمانوں نے حمص کے عیسائیوں سے لیا ہوا جزیہ واپس کردینے کا فیصلہ کیا اوران سے کہا کہ ہم تمھاری حفاظت اور مدد نہیں کرسکے؛لہٰذا تم خود اپنا انتظام کرلو اور ہم تم سے لیا ہوا مال واپس کیے دیتے ہیں،تو حمص والوں نے کہا کہ تمھاری ولایت اور انصاف ہمارے لیے ہمارے بادشاہ کے ظلم وجور سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہے اور ہم سب تمھاری فوج اور سپہ سالار کے ساتھ مل کر ہرقل کی فوج کا مقابلہ کریں گے،اسی طرح دوسرے شہروں کے ان یہود ونصاریٰ نے بھی یہی بات کہی،جن سے مسلمانوں نے صلح کر رکھی تھی،ان سب نے کہا کہ اگر روم کا بادشاہ اوراس کی فوج ہم پر غالب آجاتی ہے،تو ہمیں پھر پہلے جیسے برے دن ہی دیکھنے پڑیں گے اور جب تک ہم مسلمانوں کی حفاظت میں ہیں،اپنی اپنی زندگی جینے کے لیے آزاد ہیں۔

اگراس موقع پر کسی شخص کو اللہ کے نبیؐ کے اس قول ’’أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوا لا اله الا اللّٰه وَأَنَّ محمدًا رَّسولُ اللّٰه‘‘ کے حوالے سے کوئی اشکال ہو اور وہ کہے کہ اللہ کے نبی تو یہ فرمارہے ہیں کہ مجھے اس وقت تک کافروں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے،جب تک وہ سب کے سب اسلام قبول نہ کرلیں،تو پھر یہ مصالحت اور کافروں کو اپنے مذہب پر برقرار رکھنے والی بات کیسے مان لی جائے؟ تو محدثین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ نبی پاکؐ کا یہ قول ایک خاص پس منظر میں ہے اوراس سے مراد عرب کے بت پرست ہیں،رہی بات یہود ونصاریٰ جیسے اہلِ کتاب کی،تو

ان کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا، جس کی صراحت گزشتہ حدیث میں ہوئی ہے، ویسے بہت سے محدثین، مثلاً امام مالکؒ اور اوزاعیؒ مشرکینِ عرب سے بھی اسی مذکورہ اصول کے مطابق عمل کرنے کے قائل ہیں، یعنی انھیں بھی اسلام پیش کیا جائے گا، نہ مانیں، تو اسلامی قلمرو میں رہنے کے عوض اُن کی حفاظت کے مصارف کے طور پر ان سے جزیہ طلب کیا جائے گا اور اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں، تو پھر ان سے قتال کیا جائے گا۔

اگر ہم غور کریں تو امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ کا مسلک اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کے پس منظر میں غلط بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ فتحِ مکہ تک جو لوگ کفر و شرک پر جمے ہوئے تھے، انھوں نے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے کی تمام تر کوششیں کر لی تھیں، پھر یہ کہ وہ لوگ تو نبی پاکؐ کی صداقت وحقانیت کو دوسرے تمام خطوں کے لوگوں سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے؛ کیوں کہ خود نبی پاکؐ بھی عربی النسب اور ان ہی کے وطن اور قوم کے فرد تھے اور جو قرآن آپ پر اتارا گیا تھا، وہ بھی ان ہی کی زبان عربی میں اتارا گیا تھا، تو اس طرح حق تو ان کی نگاہوں کے سامنے بالکل واضح اور صاف تھا، اگر وہ اس کے باوجود ایمان نہیں لائے، تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ راہِ حق سے خود بھی سرگرداں تھے اور متبعینِ حق کو ان کے راستے سے ہٹانے اور بھٹکانے پر بھی تلے ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ شرک اور کفر سراسر ایک باطل مذہب ہے اور باطل مذاہب کے پیروکاروں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ حق کے خلاف پوری قوت سے اٹھ کھڑے ہوتے اور حق پرستوں کو دبانے اور مٹانے کے لیے تمام تر تدبیریں بروئے کار لاتے ہیں، ماضی میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور عصرِ حاضر میں بھی یہ سلسلہ پوری قوت کے ساتھ جاری وساری ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج دنیا میں جو قومیں متمدن اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں، وہ اپنی شان وشوکت کے تحفظ کی خاطر کیا کیا نہیں کر رہی ہیں، صرف اپنے مفادات کی خاطر آئے دن لاکھوں انسانوں کی جانیں لے رہی ہیں، ملکوں کو تاراج اور شہروں کو برباد اور نیست و نابود کر رہی ہیں؛ لیکن چوں کہ دانش وبینش اور فکر و عقل کے پیمانے بدل چکے ہیں؛ اس لیے ان پر تو کوئی بھی اشکال نہیں کرتا، کیا اپنا سرِ پُرغرور اونچا رکھنے کے لیے ان کی یہ انسانیت کُش کارروائیاں حلال ہیں؛ جب کہ یہی اگر کوئی اور قوم اپنے تحفظ کی خاطر کرتی ہے، تو اس کے لیے حرام قرار دیا جاتا ہے۔

فتحِ مکہ کے بعد عرب کے بیشتر افراد اور قبائل اسلام کی حقانیت کو سمجھ لینے کے بعد اس کے دامن سے وابستہ ہو چکے تھے، ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، جو تاہنوز اپنے کفر پر اڑے

ہوئے تھے، ایسے میں ان کے ساتھ جو بھی کیا گیا، وہ ظلم ہرگز نہیں تھا، وہ عین انصاف تھا اور اس سے اسلام کے خلاف افترا پردازی کرنے والوں کو دلیل پکڑنے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔

(۵) پھر بہتان طرازوں کو اگر سیرتِ نبوی کا یہ پہلو سمجھ میں آجائے، جو سراسر عفوودرگذر اور رحمت ومسامحت پر مشتمل ہے، تو شاید ہی وہ اس کی جرأت کرسکیں، کیا آپ ﷺ نے جنگی قیدیوں کو کبھی بھی اسلام لانے پر مجبور کیا؟ کبھی نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا، مثال کے طور پر قبیلہٴ بنی حنیفہ کے سردار ثُمامہ بن اُثال حنفیؓ کا واقعہ لے لیجیے، جنھیں مسلمانوں نے کسی سریہ میں گرفتار کرلیا تھا، وہ لوگ انھیں پہچانتے بھی نہیں تھے، صحابہٴ کرامؓ انھیں پکڑ کر آپ کی خدمت میں لائے، جب آپ نے انھیں دیکھا، تو فوراً پہچان گئے کہ یہ تو اپنے قبیلے کے سردار ہیں، آپ ﷺ نے انھیں ان کے حسبِ مقام عزت واحترام دیا، انھیں تین دن تک اپنے یہاں ٹھہرائے رکھا، ہر دن آپ ﷺ ان سے خیریت پوچھتے، وہ جواباً عرض کرتے کہ اگر آپ کو مجھ سے مال چاہیے، تو میں دینے کو تیار ہوں اور اگر آپ مجھے قتل کردیتے ہیں، تو ایک (مجرم) خون والے شخص کا قتل کریں گے (یعنی آپ کو جنگ کے اصول کے مطابق اس کا بھی اختیار ہے کہ آپ مجھے قتل کردیں) اور اگر آپ ﷺ مجھ پر احسان کرتے ہیں، تو آپ ایک احسان شناس شخص پر احسان کریں گے (یعنی میں آپ کے احسان کا بدلہ چکادوں گا)، نبی پاک ﷺ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے، یہاں تک کہ نبی پاک ﷺ اور مسلمانوں کی نرم خوئی اور حسنِ سلوک نے ثُمامہ کے دل کو نرم کردیا حضور ﷺ نے انھیں چھوڑ دیا؛ چنانچہ وہ گئے، غسل کیا، پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوری خوش دلی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ایمان قبول کرلیا اور آپ ﷺ سے کہا ”اے محمد ﷺ روئے زمین پر آپ سے زیادہ مبغوض میری نگاہوں میں کوئی نہیں تھا؛ لیکن اب روئے زمین پر آپ سے زیادہ محبوب شخص میری نگاہوں میں کوئی نہیں ہے، بخدا! پہلے روئے زمین پر آپ کے لائے ہوئے مذہب سے زیادہ ناپسندیدہ میرے نزدیک کوئی مذہب نہیں تھا؛ لیکن اب آپ کا لایا ہوا دین اور مذہب میرے نزدیک سب سے پسندیدہ اور محبوب بن چکا ہے، پہلے آپ کے شہر سے زیادہ ناپسندیدہ میرے لیے کوئی بھی شہر نہیں تھا؛ مگر اب آپ کے شہر سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ بھی کوئی شہر نہیں“۔

آپ ﷺ کو ان کے اسلام لانے سے بڑی خوشی ہوئی؛ کیوں کہ وہ قبیلے کے سردار تھے اور بعد میں ان کی اتباع میں ان کے قبیلے اور قوم کے بہت سے افراد نے اسلام قبول کرلیا، پھر نبی پاک ﷺ کی مسامحت اور نرمی کا یہ معاملہ صرف ثمامہ اور ان کی قوم تک ہی محدود نہیں رہ گیا؛ بلکہ یہ آگے بڑھ کر

ان لوگوں تک بھی پہنچ گیا، جو مسلمانوں کے روایتی اور پکے دشمن تھے، ہوا یوں کہ جب ثمامہ اور ان کی قوم اسلام لے آئے اور اسلام لانے کے بعد یہ لوگ اپنے وطن واپس لوٹے، تو اولاً تو مکہ والوں نے انھیں بھی تنگ کرنا چاہا؛ مگر چوں کہ یمامہ کے غلہ جات ہی سے ان کی گزر بسر ہوتی تھی؛ اس لیے انھوں نے اپنا ارادہ منسوخ کر دیا؛ لیکن ثمامہ نے مسلمانوں پر ان کے مظالم کا بدلہ لینے کی غرض سے ان کو غلہ نہ دینے کی قسم کھا لی، اب مکہ والے زبردست مصیبت میں پھنس گئے، انھیں کوئی راہ اس مشکل سے نکلنے کی نظر نہ آتی تھی، بالآخر انھیں ایک امید گاہ نظر آئی اور وہ خواہی نخواہی آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچے، معاملہ بتایا اور سفارش کی درخواست کی۔ ایسے موقعے پر دنیا کا عام قسم کا قائد، فاتح یا مصلح کیا کرتا، یہ کوئی بھی باعقل شخص سمجھ سکتا ہے؛ لیکن ہمارے نبی ﷺ نے وہ نہیں کیا، آپ نے ثمامہ کو اپنی قسم پر برقرار رہنے اور مکہ والوں کو ایمان لانے پر مجبور کرنے کو نہیں کہا، نہ خود آپ نے اس وقت مکہ والوں کو اس قسم کی کوئی بات کہی؛ بلکہ آپ نے ثمامہ کو خبر بھجوائی کہ مکہ والوں تک غلہ رسانی کا سابقہ نظام جاری رکھو، انسانی دنیا کا کوئی بھی مذہب کشادہ ظرفی اور انسانیت نوازی کی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے؟

حضرت ثمامہ نبی پاکؐ کے ذاتی کردار اور مسلمانوں کے حسنِ سلوک اور اسلام کی حقانیت سے کس قدر متاثر ہوئے تھے، اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپؐ کی وفات کے بعد یمامہ میں مسیلمہ کذاب کا فتنہ ظہور پذیر ہوا اور بہت سے لوگ مرتد ہو گئے، تو بھی ثمامہ اور ان کے متبعین نے ارتداد کی راہ نہیں اختیار کی، وہ پکڑ پکڑ کر مسیلمہ کے جھوٹے دعویِ نبوت پر ایمان لانے والوں کو سمجھاتے اور چیخ چیخ کر لوگوں کو کہتے ''تم اس تاریکی سے بچو، جس میں روشنی کا شائبہ تک نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے یہ فتنہ اپنے متبعین کے لیے لعنت ومحرومی کا سبب ہے اور نہ ماننے والوں کے لیے وقتی آزمایش ہے''؛ لیکن جب ان کے اس اعلانِ عام کے باوجود مرتدین نے ان کی بات نہیں مانی، تو ثمامہ اپنے لوگوں کو لے کر علاء بن حضرمی کے پاس چلے گئے اور پھر مسیلمہ اور اس کی جھوٹی نبوت کو ماننے والوں کی اچھی طرح خبر لی۔

ایک اور واقعہ: جب آپؐ نے مکہ فتح کر لیا اور مسلمان اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاص نصرت اور مدد کی بدولت مکے میں داخل ہو گئے، تو وہاں پہنچنے کے بعد اولاً تو آپ نے عفوِ عام کا اعلان کر دیا، مگر کچھ ایسے لوگ تھے، جو ماضی میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت اور ایذا رسانیوں میں بڑا نام پیدا کیے ہوئے تھے اور انھوں نے مسلمانوں کو بھی طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی تھیں، ایسے لوگوں

کے بارے میں آپ نے اعلان یہ کیا کہ وہ یا تو مکہ چھوڑ کر نکل جائیں یا مسلمان انھیں جہاں بھی دیکھیں قتل کردیں، ان کے لیے ان کے سنگین جرائم کی وجہ سے معافی کی کوئی گنجایش نہیں تھی، ایسے ہی لوگوں میں سے ایک صفوان بن امیہ بھی تھے، جب ان کو معاملے کی بھنک لگی، تو وہ چھپ گئے؛ بلکہ انھوں نے گھبراہٹ کے عالم میں خودکشی کا ارادہ کرلیا، اتنے میں ان کے چچازاد بھائی عمیر بن وہب جمحی آپؐ کی خدمت میں آئے اور انھوں نے آپ سے کہا ''اللہ کے رسول! صفوان اپنی قوم کا سردار ہے اور وہ اپنے آپ کو سمندر میں غرق کرکے ہلاک کرنے جارہا ہے، آپؐ اسے امان دے دیں''، نبی پاکؐ نے ان کی یہ بات سن کر اپنا عمامۂ مبارک اتارا اور ان کے سپرد کردیا، یہ اس بات کی علامت تھی کہ آپ نے صفوان کو امان دے دی، عمیر عمامہ لیے ہوئے سیدھے صفوان کے پاس پہنچے اور ان سے کہا ''میرے ماں باپ تجھ پر وارے جائیں، میں تمھارے پاس دنیا کے افضل ترین، سب سے زیادہ بااخلاق، سب سے زیادہ بردبار، سب سے بہتر شخص کے پاس سے آرہا ہوں، وہ تمھارے چچازاد ہیں، ان کی عزت تمھاری عزت ہوگی، ان کا شرف تمھارا شرف ہوگا اور ان کی سلطنت تمھاری سلطنت ہوگی'' صفوان نے ان کی بات سن کر کہا ''نہیں مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے'' تو عمیر نے ان سے کہا ''نہیں تمھیں کوئی خطرہ نہیں، آپؐ کی بردباری اور شرافتِ نفس کا تم اندازہ بھی نہیں لگاسکتے، انھوں نے تمھیں امان بھی دی ہے اور اس کی علامت بھی میرے پاس بھجوائی ہے اور پھر انھوں نے صفوان کو نبی پاکؐ کا عمامہ دکھلایا، تب جاکر صفوان کو یقین آیا؛ مگر اب بھی کچھ نہ کچھ خلش باقی تھی؛ چنانچہ نبی پاکؐ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد صفوان نے آپؐ سے پوچھا کہ عمیر یہ کہہ رہے ہیں کہ آپؐ نے مجھے امان دے دی ہے، تو آپؐ نے جواب دیا ''اس کی بات درست ہے'' پھر انھوں نے کہا ''کیا آپ مجھے (مذہب کے سلسلے میں غور کرنے کے لیے) دو مہینے کی مہلت دیں گے؟'' تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ''دو نہیں، ہم تمھیں چار مہینوں کی مہلت دیتے ہیں'' بالآخر صفوان نے بھی اسلام قبول کرلیا اور صحابہ کی مقدس جماعت میں وہ بھی شامل ہوگئے۔

ان سارے واقعات کے پسِ منظر سے واقفیت کے بعد بھی کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، تو یہ اس کے دماغ کا فتور ہے اور کچھ بھی نہیں۔

(۶) جو لوگ بھی اسلام کے خلاف اس قسم کا پروپگنڈہ کرتے ہیں، خود وہ بھی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اگر کسی آدمی سے کوئی بات زبردستی منوالی جائے، تو موقع ملتے ہی وہ شخص اس کا انکار کرنے لگتا ہے اور جب بھی اسے طاقت وقوت حاصل ہوتی ہے، وہ فریقِ مقابل پر چڑھ دوڑتا

ہے؛ مگر ہمیں اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ جب نبی پاکﷺ کی رحلت ہوگئی، تو بہت معمولی اور غیر معتد بہ جماعت کے علاوہ اکثر مسلمان اسی مذہب پر قائم رہے، جس پر محمد ﷺ انھیں چھوڑ گئے تھے، یہی نہیں وہ سب کے سب اپنے نبی کی چھیڑی ہوئی تحریک کو لے کر آگے بڑھے اور ان کے نبی نے اپنے آخری سفرِ حج میں انھیں جس امانت کی ادائیگی پر مقرر کیا تھا، اسے بخوبی اور پوری دیانت داری کے ساتھ اس کے حق داروں تک پہنچایا، اس راہ میں انھیں مخالفین سے لڑنے اور جنگ کرنے کی نوبت آئی، تو اس سے بھی پیچھے نہ ہٹے اور بالآخر نبیﷺ کی وفات پر ایک صدی سے بھی کم عرصہ گزرا تھا کہ انھوں نے اسلام کو دنیا بھر کے بیشتر خطوں تک پہنچا دیا، اس مہم میں پیش آنے والی معرکہ آرائیوں میں ان عربوں نے جس دیدہ وری اور جان وتن سے بے پروائی کا مظاہرہ کیا، اسے دیکھتے ہوئے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے دین پر کسی کو بھی زبردستی ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا تھا؛ بلکہ انھوں نے انتہائی خوش دلی، اطمینانِ قلب اور برضا ورغبت اسلام قبول کیا تھا اور یہی وجہ تھی انھوں نے اس دین کے تحفظ کی خاطر آپﷺ کی زندگی میں بڑی سے بڑی قربانیاں ہنستے کھیلتے دیں اور آپﷺ کی وفات کے بعد بھی دنیا کے کسی بھی کافر ومشرک اور وقت کے ظالم و جابر بادشاہ کا سرِ پرغرور ان کے ایمانی جلال اور طاقت وقوت کے سامنے بلند ہونے کی جرأت نہ کرسکا۔

(۷) پھر بعد کے زمانوں میں جب اپنی سیہ کاریوں اور عملی زوال کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی برتری جاتی رہی اور دنیا بھر سے ان کی حکومت وسیادت چھین کر قدرت نے غیروں کے ہاتھوں میں تھمادی، تاتاریوں نے مسلمانوں کو تہہ وبالا کیا، صلیبیوں نے مکر وسازش اور ظلم وجور کے کھیل کھیلے اور اب گزشتہ صدی سے سامراجیت دنیا پر اپنا نقشہ جمائے اور مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مصروفِ تدبیر ومنصوبہ بندی ہے اور مجموعی طور پر مسلمانوں کی کوئی ظاہری طاقت وقوت نہیں، نام نہاد اسلامی مملکتوں میں انتشار وخلفشار ہے، مسلم قیادت جاں بلب ہے، مسلمانوں کے علمی وسائنسی سوتے تقریباً خشک ہوچکے ہیں، عالمی معیشت سامراجی نظام کے علَم برداروں کے ہاتھ میں ہے، عالمی سیاست کی گاڑی ان ہی کی بنائی ہوئی پٹری پر چل رہی ہے، دنیا بھر کو قرض فراہم کرنے والا عالمی بینک ان کے پاس ہے، تہذیب وثقافت اور ترقی وعروج کے ہزار وسائل، نعرے، منزلیں اور سنگ ہائے میل خوش قسمتی سے ان کی پابوسی کررہے ہیں؛ مگر اس سب کے باوصف کوئی بتائے کہ کیا دنیا بھر کی مسلمان نسل اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کی طرف

رخ کر رہی ہے، یہ تو روزانہ ہورہا ہے کہ دنیا بھر کے ملکوں میں اسلام کا مطالعہ کرنے والوں،اس کے حقائق تک رسائی حاصل کرنے والوں اوراس کی خوبیوں سے متاثر ہوکراس کے دامن میں پناہ لینے والوں کی تعداد میں لگاتار اورروز افزوں اضافہ ہورہا ہے؛ مگر کہیں سے ایک بھی ایسی خبر نہیں کہ مسلمان اپنے دین سے بیزار ہوکر یا کسی دوسرے دین اور مذہب کی خوبی سے متاثر ہوکراس کی جانب مائل ہوگئے ہوں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے آباواجداد نے بھی دل کی گہرائی اور روح کے اطمینان کے ساتھ ایمان کو قبول کیا تھا اور وہ بھی اپنے اندر پائی جانے والی ہزار خامیوں کے باوجود اس مذہب کی صحت وصداقت کو دل وجان سے مانتے اوراس پر یقین رکھتے ہیں۔

فی الوقت عالمی سطح کے تمام سرکاری وغیر سرکاری سروے کی رپورٹوں سے یہ پتا چل رہا ہے کہ دنیا بھر میں اور خصوصاً ان ملکوں میں، جہاں اسلام مخالف تحریکوں کو ہوادی جاتی؛ بلکہ جہاں سے ایسی تحریکوں کے بدبودار چشمے اُبلتے ہیں، ان ملکوں میں مسلمانوں کی تعدا دلگاتار بڑھ رہی ہے، مغربی معاشرہ اور وہاں کے اصول واقدار نے لوگوں کواس قدر پریشان اور بے چین کرر کھا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف ہزار بہتان طرازیوں کے باوجود اس کی سچائیوں کا پوری غیر جانب داری کے ساتھ مطالعہ کرتے اور پھراس کے دامن سے وابستہ ہوجاتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان خطوں کے ایسے لوگوں کوتو کوئی بھی مسلم داعی یا مبلغ یا حکومت،اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کررہی۔

پھر آج دنیا کے جو ممالک سب سے زیادہ مسلم آبادی والے شمار کیے جاتے ہیں،ان کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ وہاں کبھی مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی،ان مقامات پر اسلام کی اشاعت کا ذریعہ مسلم تاجروں،علماء کے اخلاق و عادات اوراسلام کی شفاف تعلیمات رہی ہیں،مثلاً انڈونیشیا، چین، افریقہ کے متعدد ممالک، یورپی ممالک اور امریکہ میں جو مسلمانوں کی تعدا دلگاتار بڑھ رہی ہے،تو کیا ان لوگوں کو تلوار کے زور پر اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا جارہا ہے؟ اسلام پر انتہا پسندی وتشدد کا الزام لگانے والوں کو مغرب کے ان نو مسلموں سے تحقیق کرنی چاہیے اور پوچھنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے سابق مذہب سے توبہ کرکے اسلام کو کیوں اپنا لیا؟ تب انھیں یقیناً اصل حقیقت کا پتا لگ جائے گا۔

ان تمام خطوں میں اسلام اپنی سماحت، اعتدال پسندی، اپنے فطری اورانسانی ذہن وفکر کو اپیل کرنے والے اصول کی وجہ سے پھیلا ہے اور پھیل رہا ہے،ہمیں روزانہ اسلام کے دائرے میں آنے والوں کی خبریں مل رہی ہیں، پھر جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہورہے ہیں، وہ کبھی اس

سے بیزاری یا دست برداری کا تصور بھی نہیں کرتے؛ حالاں کہ عصرِ حاضر کے پشتینی مسلمان تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کے اپنے فریضے کو ادا کرنے میں اس دل چسپی اور سنجیدگی کا مظاہرہ بھی نہیں کر رہے، جو ان سے اسلام چاہتا اور جس کی نبی پاکؐ نے اپنے آخری دور میں انھیں تلقین کی تھی، جس قدر اہمیت اور سرگرمی کے ساتھ عیسائی مشنریز اپنے نظریات و خیالات وعقائد کی تبلیغ و اشاعت میں جدوجہد صرف کر رہی ہیں، اگر مسلمان اس کا عشرِ عشیر بھی کریں، تو سال بہ سال اسلام لانے والوں کی تعداد نہ معلوم کس برق رفتاری اور کثرت کے ساتھ بڑھنے لگے۔

اسلام اور اس کی اشاعت کے حوالے سے یہ وہ حقائق ہیں، جنھیں کوئی بھی غیر جانب دار انسان تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اگر ان کے باوجود دشمنانِ اسلام جھوٹے پروپگنڈوں میں مصروف ہیں اور وہ دنیا میں اسلام کی شبیہ کو بگاڑنے اور پیغمبرِ اسلام اور قرآن کی تعلیمات میں تحریف کرکے دنیا کو گمراہ کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں، تو ایسے لوگوں کے بارے میں تو ہم وہی کہیں گے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی لا ثانی معجزاتی کتاب قرآن کریم میں فرمایا ہے:

"كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ، إِنْ يَقُوْلُوْنَ إِلَّا كَذِبًا". (الکہف:۵)